پرچھائیاں از ساحر لدھیانوی، مابعد نوآبادیاتی مطالعہ

Parchayan of Sahir Ludhianvi: A Postcolonial Study

ڈاکٹر ساجد جاوید

Abstarct

Sahir Ludhianvi was a modern Urdu progressive poet of 20th centuary. He presented an anti colonial view of Subcontinent (India and Pakistan) and apply his De-Colonial voice on the glimpses of this territory under the reign of the English colonizers. He is a unique and an important poet in the Post Colonial world of literature. Post colonial study of his long poem "Parchayan" is presented here.

Key Words: Postcolonialism, Sahir Ludhanavi, Progressive writers of Urdu

رومان، رومان پروری اور حقیقت پسندانہ حقائق کی پیش کش اور اس پر طرۂ امتیاز ترقی پسند فکر کا حامل ہونا ساحر لدھیانوی کی شاعری کا وصف خاص بن کر شعروں کی اقلیم میں محفوظ ہو چکا ہے۔ ترقی پسند شاعر ہونے کے باوصف ان کے ہاں انسان اور انسان دوستی ایک بنیادی محور و مرکز بن کر شاعری میں رقصاں ہے مگر انسانیت نواز فکر میں رومان کی لہر درجہ بدرجہ چلتی پھرتی محسوس ہوتی ہے۔ اس ضمن میں وطن سے محبت کا لاثانی جذبہ اور نوآبادیاتی استعماریت کی کریہہ صورتیں پہلو بہ پہلو ملتی ہیں اور یادوں اور دریافتوں کا قافلۂ روز و شب ساحر کی شاعری کے اندر سے بہت سے نئے نئے پہلو اجاگر کرتا ہے۔ اس سے شاعر کی پہلو دار شخصیت اور سوچنے کا باکمال انداز لفظوں اور مصرعوں کو مضبوط معنویت کی لذتوں سے ہمکنار کرتا چلا جاتا ہے۔ ان کی ایک کتاب کا عنوان ''پرچھائیاں'' ایک فرد، معاشرے، وطن، استبداد، جابر و مجبور، قاہر و ظالم شہنشاہوں کے رعایا کے خون سے تعمیر کیے گئے تاج محلوں میں گندھے ہوئے موضوعات کا ایک جہان حیرت ہے۔ یہ ایک طویل نظم ہے جو ساحر لدھیانوی کے مابعد اور رد نوآبادیاتی نقطہ نظر سے آگاہی کے لیے ایک بہترین مثال بنتی ہے۔ استعمار کو رد کرنے کا رویہ ان سے قبل اقبال کے ہاں بھی موجود تھا جس سے آنے والی شعرا کی نسل نے اس موضوع کی توسیع کے زاویے اپنے انفرادی ہنر کے ساتھ اردو شعری منظر نامے کا حصہ بنائے۔ یہاں یہ امر دلچسپی کا حامل ہوگا کہ صدی کے سب سے بڑے شاعر علامہ اقبال کے ہاں بھی رد نوآبادیات کی جھلک دیکھی جائے۔ اقبال کے مطابق،

> تمام ترقی کے باوجود اس زمانے میں ملوکیت کے جبر و استبداد نے جمہوریت، قومیت، اشتراکیت، فسطائیت اور نہ جانے کیا کیا نقاب اوڑھ رکھے ہیں۔ ان نقابوں کی آڑ میں دنیا بھر میں حریت اور

شرف انسانیت کی ایسی مٹی پلید ہورہی ہے کہ تاریخ عالم کا کوئی تاریک سے تاریک صفحہ بھی اس کی مثال پیش نہیں کرسکتا۔۔۔جن حاکموں کا یہ فرض تھا کہ وہ اخلاق انسانی کے نوامیس عالیہ کی حفاظت کریں،انسان کو انسان پر ظلم کرنے سے روکیں انھوں نے ملوکیت واستعمار کے جوش میں لاکھوں کروڑوں مظلوم بندگان خدا کو ہلاک و پامال کرڈالا اور صرف اس لیے کہ ان کے اپنے مخصوص گروہ کی ہواوہوس کی تسکین کا سامان بہم پہنچایا جائے۔(۱)

نظم پر چھائیاں میں موضوعاتی پہلوداری کی متنوع جہات نمایاں ہوتی ہیں لیکن پر چھائیوں کا کہیں دھندلا کہیں واضح خاکہ شاعر کو بار بار اس موضوع کی طرف واپس بلاتا ہے جو وطن سے محبت کے مظاہر سے مملو ہے۔ بنیادی طور پر اس نظم کا موضوع ہندوستان کے اس دیسی اور دیہاتی خوشگوار ماحول ومعاشرت کے زوال پذیر ہونے کا نوحہ ہے جو انگریزی استعماریت کے ہتھکنڈوں سے زمین بوس ہوا اور اس کے نتیجے میں ایسا بے حس اور کریہہ صورت سماج سامنے آیا جس میں اخلاقی اقدار کی تنزلی، محبت کے مظاہر کی بے قدری اور غلیظ قسم کی اداسی نسلوں کا مقدر بنی۔ نو آبادیاتی دور نے ہندوستان کے روایتی سماج اور معاشرت کا دھارا غیر فطری طور پر اتنی تیزی سے تبدیل کر دیا تھا کہ آہستگی لیکن ثابت قدمی سے چلا جانے والا معاشرہ اس تبدیلی کو سمجھ نہیں سکا۔اس کے نتیجے کے طور پر جو تباہیاں اس معاشرت کا حصہ بنیں، ان پر ساحر لدھیانوی بسیط مگر طنزیہ انداز سے شعری تبصرہ کرتے ہیں جس سے انکار دنو آبادیاتی (Anti-Colonioal Attitude) رویہ سامنے آتا ہے۔نظم کی خوبصورتی یہ ہے کہ شاعر آخر میں محض مبصر نہیں رہتا بلکہ وطن پرست فرد بن کر حریت ومزاحمت کا استعارہ بنتا ہے۔نظم کا آغاز پہلی پر چھائیں سے ہوتا ہے جب شاعر کی آنکھ اس دور اور اس دیار میں کھلتی ہے جب رومان کی دنیا اور خوابناک مسرت افزا ماحول ہندوستان کا حصہ تھا۔

جوان رات کے سینے میں دودھیا آنچل
مچل رہا ہے کسی خواب مرمریں کی طرح
حسین پھول، حسیں پتیاں ، حسیں شاخیں
لچک رہی ہیں کسی جسم نازنیں کی طرح
فضا میں گھل سے گئے ہیں افق کے نرم خطوط
زمیں حسین ہے خوابوں کی سرزمیں کی طرح
تصورات کی پرچھائیاں ابھری ہیں!(۲)

تصورات کی پرچھائیاں شاعر اور قاری کو ایک لطف انگیز اور انساط آمیز ماحول کے کیف آفریں ماحول میں لے جاتی ہیں۔ جہاں ہم اس ساکت وصامت کھڑے درخت سے ملتے ہیں جس کی چھاؤں میں کبھی دو دل پناہ لیتے تھے،خواب بنتے تھے،تعبیریں تلاشتے تھے۔ ماں جیسی مقدس چھاؤں امین تھی ان دعاؤں، وعدوں اور التجاؤں کی

جوان پیار کرنے والے دو دلوں نے اس درخت کے حوالے کیے تھے۔تصورات اور یادوں کی انبساط اور غم والم میں ڈوبی ہوئی پرچھائیاں اس وقت شاعر کے حافظے میں آتی ہیں جب ایک عرصے بعد محبوب ومحبّ اسی خاموش کھڑے درخت کے نیچے لمبے عرصے بعد ملتے ہیں۔اب کے بار ملاقات میں استعمار زدہ ماحول نے جو جو تبدیلیاں معاشرے کا حصہ بنادی تھیں،ان کو یاد کرتے ہیں اور پرانے دور سے اس کا تقابل کرتے ہیں۔شاعر لکھتا ہے:

یہی فضا تھی، یہی رت، یہی زمانہ تھا
یہیں سے ہم نے محبت کی ابتدا کی تھی
دھڑکتے دل سے لرزتی ہوئی نگاہوں سے
حضور غیب سے ننھی سی التجا کی تھی
کہ آرزو کے کنول کھل کے پھول ہو جائیں
دل و نظر کی دعائیں قبول ہو جائیں
تصورات کی پرچھائیاں ابھرتی ہیں

اس فضا کا بند آنکھوں سے مشاہدہ کیا جائے تو ہمارے سامنے نو آبادیاتی استبداد سے قبل کا وہ دور آتا ہے جس کی عملداری سے قبل فضا میں رومانوی مظاہر بھرے پڑھے تھے۔''زندگی کی چھوٹی سی کشتی'' بھلے آہستگی سے چل رہی تھی مگر ہواؤں کے رخ پر بڑھتی جارہی تھی اور اس فضا میں ندی کے ساز پر ملاح کا گیت کائنات میں پھیلی ہوئی رنگینیوں کی مانند خوبصورت تھا۔نظم کے مصرعوں میں حسیت کی سطح کا اندازہ اس امر سے لگایا جاسکتا ہے کہ شاعر کو کشتی میں بیٹھے ہوئے لہروں کے وہ جھکولے بھی یاد ہیں جن کی وجہ سے محبوب کا جسم محبّ کی بانہوں میں جھول جاتا تھا۔مگر یہ خواب اس وقت ٹوٹتا ہے جب تصورات کی پرچھائیاں دوبارہ ابھرتی ہیں۔

میرے گلے میں تمہاری گداز باہیں ہیں
تمہارے ہونٹوں پہ میرے لبوں کے سائے ہیں
مجھے یقین کہ ہم اب کبھی نہ بچھڑیں گے
تمہیں گمان کہ ہم مل کے بھی پرائے ہیں
تصورات کی پرچھائیاں ابھرتی ہیں

نشاط آمیز لمحات میں شاعر ان گیتوں کو مدھم سروں میں اپنے محبوب کی زبانی سنتا ہے جو عموماً سہاگ رات میں ڈھولک میں گائے جاتے ہیں۔ڈرامائی انداز سے اب منظر بدلتا ہے اور یہ تمام تصورات کی پرچھائیاں محض گزرا ہوا زمانہ تصوراتی دنیا کی مانند نظروں سے اوجھل ہوتا ہے۔اس سارے منظر نامے میں محبوب کو انسانی پیکر کی بجائے

وطن سمجھا جائے تو وطن سے محبت کی سطح ایک نئے انداز سے واضح ہو کر سامنے آتی ہے۔ اجنبی اقوام اور افراد کے ہندوستان آمد سے قبل کے منظر نامے کو شاعر نے ایک خیالی جنت سے تعبیر کیا ہے جو ایک خواب کی مانند آگے بڑھتا ہے مگر یکا یک انگریز استعمار کے آنے کی علامت بن کر بارود کا نقارہ بجتا ہے اور منظر بدلتا ہے۔ ایم انیس قادری لکھتے ہیں،

> رومانیت کے پردے میں اس نے جو احتجاجی رویہ اپنایا ہے وہ اسی کا حصہ ہے۔ وہ بلا خوف استحصال پسند قوتوں کے خلاف علمِ بغاوت بلند کرتا ہے اور تمام منفی اقدار کو ملیا میٹ کرنا چاہتا ہے۔۔۔(وہ) انسانیت کے لئے خیر کا طالب ہے۔ قحط بنگال ہو کہ مسلم کش فسادات، اردو دشمنی ہو یا اشتراکیت کا فلسفہ، وہ کھلے ڈلے انداز میں استحصالی قوتوں کے خلاف آواز اٹھاتا ہے اور تمام مصلحتوں کو بالائے طاق رکھ دیتا ہے۔ (۳)

مغرب کے نام نہاد مہذب ملکوں سے نکالے گئے غیر مہذب خاکی پوش اس دھرتی کا رخ کرتے ہیں۔ ان کے اندر سب سے بڑی خامی جو شاعر کو نظر آئی وہ غرور تھا جس کی مستی میں یہ لوگ مقامی افراد سے خود کو برتر سمجھنے لگے۔ سکوت بھرا ماحول اور سکون بھری زمین پر ان کے خیموں کی طنابیں گڑیں تو شاعر کو وہ میخیں اپنے دل میں چبھتی ہوئی محسوس ہوئیں۔ تشبیہ کا انداز ملاحظہ ہو کہ شاعر نے اپنے وطن کی راہوں کو مکھن کی طرح ملائم راہیں قرار دیا جن پر اس دیو استبداد کے بوٹوں کی خراشیں پڑیں۔ فوجی بینڈ کی سمع خراش چنگھاڑ نے دیس کے چرخے کی مدھر لے کو دبا دیا اور وطن کی وہ اجلی فضا جس میں پھول ہر سو اپنی قبائیں پھیلائے ایک شان بے نیازی سے کھڑے تھے۔ جیپوں کے ٹائروں سے اڑنے والی دھول نے ان کا بانکپن مٹی کر دیا۔ اس سارے سین میں ساحر لدھیانوی کے لہجے میں ہمیں رومان اور حقیقت پسندی کی دورنگی بڑے خوبصورت انداز سے دکھائی دیتی ہے۔ ایک جنت سمان دھرتی کو مغرب سے آئے ہوئے استعمار نے یکسر بدل کے رکھ دیا۔ شاعر کے مشاہدے کی قوت کی داد دینا پڑتی ہے کہ خاموش زمین، مکھن سی ملائم راہیں، چرخوں کی صدائیں اور پھولوں کی قباؤں کو ایک بدیسی ماحول اور معاشرت نے بدل کے رکھ دیا۔ یہ ایک المیہ ہے، ایک نوحہ ہے جس کو حساس دل رکھنے والا شاعر ہی محسوس کر سکتا ہے۔ نو آبادیاتی عہد کے آغاز سے یہ نرم و ملائم محسوسات ہی مجروح نہیں ہوتے بلکہ یہ تو پہلا مرحلہ تھا۔ آگے چل کر اس رجحان اور معاشرے کی مستقل قدروں کی شکست و ریخت سے کس طرح کا منظر نامہ برآمد ہوا، اس کا بیان زیادہ توجہ طلب ہے۔ نو آبادیاتی عہد میں محض رومان پرور نظارے ہی رخصت نہیں ہوئے بلکہ انسان کی قیمت گری، اجناس کے بھاؤ چڑھے اور ظلم یہ ہوا کہ وہ دھرتی جس کو فوجی رکھنے کی ضرورت نہیں تھی اس کے جوان بھرتی کے نرغے میں آئے۔ اس طرح گاؤں کے چوپال کی رونقیں ختم ہوئیں اور ملازمت کی بھرتی کے دفتروں میں رش بڑھنے لگا۔ شاعر اس المیے کا ذکر یوں کرتا ہے:

انسان کی قیمت گرنے لگی اجناس کے بھاؤ بڑھنے لگے

چوپال کی رونق گھٹنے لگی، بھرتی کے دفاتر بڑھنے لگے
بستی کے سجیلے شوخ جواں بن بن کے سپاہی جانے لگے
جس راہ سے کم ہی لوٹ سکے اس راہ پہ راہی جانے لگے
ان جانے والے دستوں میں غیرت بھی گئی برنائی بھی
ماؤں کے جواں بیٹے بھی گئے بہنوں کے چہیتے بھائی بھی

غرض اس عہد کے آتے ہیں جہاں پر اخلاقی اقدار میں اتھل پتھل ہوئی اور رسم ربط اٹھی وہیں پر معاشرتی سطح پر بھی شکست و ریخت نے اپنا رنگ دکھایا۔ ایک نیا سماج پرانے سماج کو تیزی سے بدل رہا تھا۔ بستیوں میں اداسیاں چھانے لگیں۔ فنون لطیفہ کی شکل وصورت بدل گئی۔ پہلے جہاں پر میلے ٹھیلے اور مختلف سماجی تہوار عوام کی دل بستگی کا ذریعہ تھے وہ ختم ہو رہے۔ بازاروں میں رش بڑھا، کھیت اور کھلیان ویران ہونے لگے۔ مصنوعی طور پر آتا ہوا صنعتی سماج منظّم زرعی سماج کو کھانے لگا۔ دکانوں سے مال ذخیرہ اندوزوں کی بدولت تہہ خانوں میں جمع ہونا شروع ہوا۔ اس زوال آمادہ تہذیب کی بے بسی کا دوسرا رخ وہ طبقہ بھی شاعر کے پیش نظر رہا جو شائد اس افراتفری میں اندھیرے میں چلا جاتا ہے اور وہ طبقہ ہے وجودِ زن۔ ساحر لدھیانوی کی نظر برصغیر کی الہڑ، کنواری دوشیزہ پر بھی ہے جو پھر وہ عورت نہ رہی جو اس ہنگام سے قبل تھی۔ منظر نامہ تبدیل ہوتا ہے۔ مفلسی سے چور کسان طبقہ پہلے ہی افلاس کے ہاتھوں زچ تھا، اس کساد بازاری کے نرغے میں آیا جس نے اس کے ہل، کھیت اور کھلیان بھی بکوا دیے۔ تنزلی کی انتہاء اس حد تک ہوئی کہ جب کھیل کھلیان بھی بک گئے اور بھوک نہ بکی تو جسموں کی تجارت نے اس فاقہ زدہ سماج کو جینے کا ایک رستہ دکھلایا۔ المیہ اس شعر میں زیادہ واضح ہوتا ہے، جب شاعر دہائی دیتا ہے :

چرواہیاں رستہ بھول گئیں، پنہاریاں پنگھٹ چھوڑ گئیں
کتنی ہی کنواریاں ابلائیں، ماں باپ کی چوکھٹ چھوڑ گئیں
افلاس زدہ دہقانوں کے ہل بیل بکے کھلیان بکے
جینے کی تمنا کے ہاتھوں جینے ہی کے سب سامان بکے
کچھ بھی نہ رہا جب بکنے کو، جسموں کی تجارت ہونے لگی
خلوت میں بھی جو ممنوع تھی وہ جلوت میں جسارت ہونے لگی
تصورات کی پرچھائیاں ابھرتی ہیں

وجودِ زن اس گوہر نایاب سے محروم ہوتی چلی گئی جس نے کبھی اس کو شانِ تمکنت عطا کی تھی۔ یہاں پر شاعر نے عورت کی تن فروشی اور در بدری کی ایک اہم وجہ بھی بیان کی ہے جو معقول ہے۔ بیسویں صدی کی دوسری

دہائی میں ہونے والی پہلی جنگ نے یورپ کی بالعموم اور انگلستان کی بالخصوص مردانہ آبادی کو بڑا نقصان پہنچایا چنانچہ انگریزوں نے ایک اہم نوآبادیاتی ہتھکنڈہ استعمال کیا اور چند منتخب افراد و قبائل کو جاگیریں عطا کر کے معاشرے میں انسانی مساوات کے تصور کو پاش پاش کر دیا، ایک اشراف کا طبقہ تیار کیا گیا جو انگریز کے مفادات کا نگران اور محافظ تھا جبکہ مقامی افراد کے لیے قہر و غضب کا استعارہ تھا۔ اس درمیانے طبقے کو نوآبادیات کے منظر نامے میں ایک اہم عامل کے طور پر سمجھا جانا چاہیے جس نے انگریز کی یورپی جنگوں کے لیے بھی ہندوستان کا جوان، تنومند اور گرم خون فوجی بنا کر بھیجا۔ اس جنگ نے ان سے ان کی زندگیاں چھین لیں، بدلے میں مقامی افراد کو ان کی ہی دھرتی بطور بخشش دی گئی۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ مقامی افراد انگریز کی جنگ میں کیوں جھونک دیئے گئے۔ بات یہیں تک نہ رہی بلکہ جن گھرانوں کے کفیل سہارے جنگوں میں کام آئے، ان کی بہنیں، عورتیں پیٹ کی آگ بجھانے کے لیے جسموں کی تجارت پر مجبور ہوئیں جو اپنی جگہ پر ایک بڑا المیہ تھا۔

اس شام مجھے معلوم ہوا جب باپ کی کھیتی چھن جائے
ممتا کے سنہرے خوابوں کی انمول نشانی بکتی ہے
اس شام مجھے معلوم ہوا جب بھائی جنگ میں کام آئیں
سرمائے کے قحبہ خانے میں بہنوں کی جوانی بکتی ہے

ترقی پسند شاعر ہونے کے باعث، مزدور، کسان کا استحصال، بڑی شد و مد سے ساحر کی شاعری کا حصہ بنتا ہے۔ ان کو سب سے پہلے اس بات پر اعتراض ہے کہ کھیت اور کھلیانوں کو ویران کر کے کارپوریٹ سیکٹر، گودام اور تہہ خانوں کے کلچر کو سوسائٹی کا حصہ بنایا گیا جس نے گھروں میں بدحالی، مہنگائی اور افلاس کے ڈیرے جما لیے۔ دہقانوں کے ہل بکے تو ان کی گھر گرہستی کی مقدس دنیا کو جسم فروشی کے لیے باہر نکلنا پڑا۔ شہروں میں جا کر محنت کرنے والوں کو بھی محنت کا مول نہ مل سکا۔ اس طرح استعمار کی فوجی بھرتی محنت کش اور وطن پر نثار ہونے والے نوجوانوں کا خون خرید کر یورپ کی جنگوں کے کام میں لایا گیا۔ ساحر جس دور میں شاعری کے میدان میں اپنی انفرادی آواز کو شعری منظر نامے کا حصہ بنا رہے تھے اس دور میں فیض احمد فیض ان نوجوان شعرا کے لیے استاد کا درجہ رکھتے تھے۔ ساحر فیض سے متاثر ہوئے اور ان کے ترقی پسند زاویوں سے اپنی شعری فکر کو ہم آہنگ بھی کیا۔ ترقی پسند شاعر کے طور پر ساحر کا فکری اور موضوعاتی سطح پر فیض احمد فیض سے اس خصوصی تعلق کی وضاحت کرتے ڈاکٹر وزیر آغا لکھتے ہیں:

> دراصل ساحر لدھیانوی فیض احمد فیض سے بہت متاثر تھا... اسلوب اور مواد کے سلسلے میں بھی وہ ان سے بہت زیادہ فیض یاب ہوا تھا۔ فیض نے اپنی ایک نظم (مجھ سے پہلی سی محبت مری محبوب نہ مانگ) میں رومان اور حقیقت کا تجزیہ دکھایا تھا۔ یوں کہ محبت پر حقیقت یعنی زمانے کے مسائل کو

ترجیح ملی تھی۔ ساحر نے اپنی متعدد نظموں میں فیض کے اس انداز کو برتا ہے۔ پرچھائیاں میں بھی محبت کی ساری کہانی حقیقت کی سنگلاخ چٹانوں سے ٹکرا کر پاش پاش ہوتے دکھائی دیتی ہے، مگر اس طور نہیں کہ ساحر پر محبت کا کرب چھا جائے، محض اسی لیے کہ احتجاجی مسائل کی گھمبیرتا کا احساس اس پر طاری ہو جائے اور اس کے قاری کو بھی بہالے جائے۔ (۴)

ساحر سے قبل کتنے نظم گوؤں نے آلام وحوادث کی مختلف شکلوں کو شاعری میں یکجا کیا ہوگا؟ یہاں ساحر کی شاعری کی ایک اور خاصیت سامنے آتی ہے جس کے تحت ہم دیکھتے ہیں کہ انہوں نے انہی رشتوں کی ناگزیریت، تقدس اور اہمیت کو اپنی شاعری کا حصہ بنایا ہے جو اردو نظم کی روایت میں غیر معمولی امر ہے۔ اردو شاعری پر عام طور پر یہ اعتراض اٹھتا ہے کہ اس میں عاشق معشوق اور رقیب کے علاوہ کسی بھی رشتے کی مضبوطی پر توجہ نہیں دی گئی لیکن ساحر لدھیانوی کے ہاں بیٹا، باپ، ماں، بہن اور محبوب کے مضبوط رشتوں کی پیش کش شاعری کا حصہ ہے۔ نوآبادیاتی دور میں Colonizer اسی صورت کامیابی اور دولت پر قابض ہو سکتا تھا کہ اپنے سامنے آنے والی توانا آوازوں کو خاموش کرا دیتا۔ اگر پھر بھی رہی سہی کسر اس کے نوجوانوں میں ہوتی تو ان کو پرائی جنگوں کا ایندھن بننے کے لیے دوسرے ملکوں میں بھیج دیا جاتا۔ چالیس اور پچاس کی دہائی میں ترقی پسند ادیبوں کے ہاں وطن کی محبت، نوآبادکار کے خلاف مزاحمت رویے اور دوسری عالمی جنگ میں انگریزوں کی طرف سے لڑتے ہوئے ہندوستانی فوجی جیسے موضوعات نظم ونثر کی زینت بنے۔ ڈاکٹر محمد حسین اپنے ایک مضمون میں انکی نظم کی خصوصیات پر تبصرہ کرتے ہیں،

> قومی آزادی کی لڑائی ہو یا بحری بیڑے کی بغاوت، فرقہ ورانہ فسادات کی قیامت خیزی ہو یا جنگ کی تباہ خیزی، ہندو پاک کی لڑائی کی لعنتیں ہوں یا بین الاقوامی سطح پر لومبا جیسے انسان دوست کی شہادت، اردو کے ساتھ نا انصافی ہو یا مزدور کسانوں کا استحصال، ساحر کی آواز نغمہ پا رہی ہے۔۔۔ ساحر ایک بے مثال مرقع ساز، نغمہ گر اور ڈرامائی لمحوں کے شاعر کی حیثیت سے اردو ادب کی تاریخ میں مدتوں یاد رکھے جائیں گے۔ (۵)

ساحر نے نظم کے آخر میں حریت کا جذبہ نظم کیا ہے جس میں اس استعماری ڈھانچے کی نفی کی ہے جس کے تحت سامراجیت، فسطائیت اور استعماریت نے انسان اور انسانیت کی تباہی اور ایشیا کی دھرتی کو غم وآلام کا مرکز بنا دیا تھا۔ جنگوں اور جنگ کا سامان بننے والے معصوم انسانوں سے محبت کا اعادہ کیا گیا ہے۔ تاجر ذہنیت کو للکار کر کہا گیا ہے کہ اب نہ کوئی کنواری بیچی جائے گی، نہ کوئی کھلیان یا کیاری جنگ کا میدان بنے گی۔ اس زمین پر دوبارہ ہل چلائے جائیں گے۔ جنگ سے نفرت کا اعلان کیا گیا ہے۔ قاتل سن لیں کہ اب کسی بھی قاتل کے لیے زمین تنگ کر دی جائے گی۔ اب زمین خون کا پیرہن نہیں پہنے گی۔ اب ملک میں قحط نہیں بویا جائے گا۔ نظم کے اس دور میں شاعر ایک حریت پسند وطن پرست اور ایک رجائیت پسند شاعر بن جاتا ہے اور یہی طرز فکر ساحر لدھیانوی کا خاصہ بن کر سامنے آتا ہے۔ ڈاکٹر محمد علی صدیقی لکھتے ہیں۔

ساحر کی نظم پرچھائیاں کے آخری بند میں تنہائیاں کا مفہوم قدرے جدا ہے۔ یہ انسانی نسل کو درپیش ایٹمی جنگ کے خطرات کے نتیجے میں مکمل تباہی کا خوف ہے۔اس دور کی تنہائی بھی، جبکہ ہم زندہ ہیں۔لیکن اگر ایٹمی جنگ کا خطرہ ٹالا جا سکے اور ہمیں اس کرہ ارض پر رہ سکنے کی مہلت (lease) مل جائے تو تنہائیوں سے زیادہ یک جہتیاں درکار ہوں گی۔(۶)

استعماری رنگ و روپ نے جہاں پر برصغیر پاک و ہند کے سماجی اور معاشرتی ڈھانچے کو اپنے رنگ میں رنگا وہیں پر پیار اور پیار کرنے والوں کی دنیا میں بھی تبدیلی کا باعث بنا۔اس افراتفری میں پیار کرنے والے سب سے زیادہ متاثر ہوئے۔محبت کی دنیا جو رمز و ایمائیت اور غمزے کی خوبصورتیوں میں ڈھل کر معاشرے میں محسوس نہ ہوتے ہوئے بھی ہوتی تھی، اب اس کے ہونے کا عجب انداز بن گیا۔اب محبوبوں کے غمزے اور عشوے استعماریت زدہ ذہنوں، رویوں اور بے باکیوں نے بے حیائی میں بدل دیے تھے۔معاشرے میں مہذب رویے دو بدو اور تو تو میں میں کا شکار ہوئے۔مگر شاعران مصنوعی اور غیر مہذب رویوں کا حصہ بنا نہ ان کو اچھا کہہ سکا۔اگر شاعر معاشرے کے اس چلن کا حصہ بن جاتا تو شاید اس کے سامنے پرچھائیاں ابھر نہ سکتیں۔محبت کے انبساط میں گزرتے ہوئے حسین اور جاوداں لمحے اس کے لاشعور سے پرچھائیاں بن کر شعور کا حصہ بنتے ہیں۔یہ الگ منظر اس طور پر صفحات کا حصہ بنتا ہے کہ آج دو دل بڑے عرصے بعد دوبارہ ملتے ہیں اور غمِ جاناں سے غمِ دوراں تک کے تغیرات کو اپنی یادوں کا حصہ بناتے ہیں۔محبت کا گزرا ہوا دور اپنی تمام تر یادوں کی بارات لیے شاعر کے حافظے کا حصہ ہے۔جواں رات کے سینے پر دودھیا آنچل، حسین پھول، دھڑکتے دل، کنول کے پھولوں کا کھلنا، کشتی کے سفر میں ہچکولوں سے محبوب کا محبّ کی بانہوں میں جھول جانا، بالوں کے جوڑے میں پھول ٹانکنا اور مسرت سے آنکھ کا جھک جانا اور خواب آگیں فضا کی یادیں اب شاعر کو خواب دکھائی دیتی ہیں اور گھوڑوں کی ٹاپیں، جیپوں کے دھوئیں، اور تعمیر کی جگہ تخریب جیسی تلخ حقیقت، حقیقت دکھائی دیتی ہے۔محبوبیت کے ادارے کا زوال شاعر کے لیے اتنا بڑا صدمہ ہے کہ وہ اس کو اتنی آسانی سے قبول کرنے پر تیار نہیں۔ساحر لدھیانوی بجا طور پر جدید شاری میں ردنو آبادیات کا نہ صرف نقیب بنتا ہے بلکہ آنے والے دور کی مزاحمتی شاعری اور شعرا کا سرخیل ٹھہرتا ہے۔

حواشی:

۱۔ اقبال، حرف اقبال، مشمولہ اقبال اور نیا نوآبادیاتی نظام از ڈاکٹر محمد آصف (لاہور: فکشن ہاؤس، ۲۰۱۹ء) ص ۱۳۔

۲۔ ساحر لدھیانوی کی طویل نظم پرچھائیاں ۱۹۵۵ء میں شائع ہوئی جس کا دیباچہ اردو ادب کے معروف ترقی پسند ادیب علی سردار جعفری نے تحریر کیا تھا اور یہ کتاب مکتبہ جدید لاہور نے شائع کی تھی۔نظم کے شعری

حوالے اسی کتاب سے ماخوذ ہیں۔

۳۔ ایم انیس قادری،اردو کے جدید شعرا،ایک تنقیدی جائزہ(لاہور:عبداللہ پبلشرز، ۱۹۹۷ء)،ص ۲۷۔

۴۔ وزیر آغا،ڈاکٹر،پرچھائیاں مشمولہ معنی اور تناظر(لاہور:مجلس ترقی ادب،۲۰۱۶)ص ۱۲-۱۔

۵۔ محمد حسین،ساحر لدھیانوی۔مرقع ساز،نغمہ گر،ڈرامائی لمحوں کا شاعر،مشمولہ معاصر ادب کے پیش رو(نئی دہلی: مکتبہ جامعہ،۲۰۱۱ء)ص ۱۰۴۔

۶۔ محمد علی صدیقی،ساحر لدھیانوی۔صورت گر کچھ خوابوں کا،مشمولہ،مضامین (کراچی:ادارہ عصر نو، ۱۹۹۱)،ص ۳۸-۲۳۷۔

مآخذ

ایم انیس قادری۔اردو کے جدید شعرا،ایک تنقیدی جائزہ۔ لاہور:عبداللہ پبلشرز، ۱۹۹۷ء۔

ساحر لدھیانوی۔پرچھائیاں۔لاہور: مکتبہ جدید، ۱۹۵۵ء۔

محمد آصف،ڈاکٹر۔اقبال اور نیا نو آبادیاتی نظام۔لاہور:فکشن ہاؤس،۲۰۱۹ء۔

محمد حسین۔''ساحر لدھیانوی:مرقع ساز،نغمہ گر،ڈرامائی لمحوں کا شاعر''،مشمولہ معاصر ادب کے پیش رو۔نئی دہلی: مکتبہ جامعہ،۲۰۱۱ء۔

محمد علی صدیقی۔''ساحر لدھیانوی:صورت گر کچھ خوابوں کا''،مشمولہ،مضامین ۔کراچی:ادارہ عصر نو، ۱۹۹۱ء۔

وزیر آغا،ڈاکٹر۔''پرچھائیاں''مشمولہ معنی اور تناظر۔لاہور:مجلس ترقی ادب،۲۰۱۶۔